الطاف جاوید

اقبال، علی شریعتی کی نظر میں

ترکی کی معروف دانشور خاتون خالدہ ادیب خانم نے اپنی کتاب (In side India) میں کہا ہے کہ سرسید ہندوستان کی جامد فضا کے پانی میں میں بھاری پتھر کی طرح گرے، جس سے بہت سی اونچی اونچی بے ربط لہریں پیدا ہوئیں۔ برطانوی حکومت اور مغربی تہذیب کے بارے میں سرسید کا رویہ معذرت خواہانہ تھا، وہ مغرب کی علمی ترقی کے ساتھ ساتھ مغربی اقوام کی معاشرت، یعنی کھانے پینے کے طور طریقے اور بود و باش وغیرہ کو بھی اختیار کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ دور اقبال پہ آکر ختم ہوگیا۔ سرسید کے باعث پیدا ہونے والی فکری اور تہذیبی لہروں میں اقبال سب سے بلند لہر تھی۔ اقبال سے مغرب کی تہذیب پر جارحانہ تنقیدی دور شروع ہوا، مغربی ممالک کے سرمایہ داروں کے کنفریویرازم (Consumerism) کے باعث ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے پسماندہ ممالک کو نو آبادیاتی نظام کے زیر تسلط لانے اور وہاں کے خام مال کے ذخائر کی لوٹ اور افراد کی محنت کو سستے داموں خریدنے کے عمل پر اقبال نے شدید تنقید کی اور اس استحصالی نظام کے باعث پیدا ہونے والی تہذیب کے مکروہ چہرہ کو بے نقاب کیا۔ اسی رویہ کے سبب اقبال نے روس میں اشتراکی نظام کی کامیابی کو خوش آمدید کہا اور توقع ظاہر کی کہ اس انقلاب کے باعث تیسری

دنیا کی محکوم اقوام کو آزادی حاصل کرنے میں مدد ملے گی اور معیشت کے استحصالی نظام کے ختم ہونے کا عمل تیز تر ہو جائے گا۔

اقبال کی اپنی حیثیت بھی سرسید کی طرح ایک بھاری پتھر کی تھی جس کے گرنے سے مغربی تہذیب کی طرف معذرت خواہانہ رویہ کی جھیل میں لہریں پیدا ہوئیں۔ ان لہروں میں سب سے تند و تیز اور اونچی لہر علی شریعتی کی تھی، جس نے مشرق کی محکوم اقوام کو اپنی تہذیبی جڑوں تک رسائی مغربی استحصال سے نجات پانے کا بڑا سبب قرار دیا۔ علی شریعتی کا سارا فکر اور ان کی تابناک جدوجہد کا بنیادی سرچشمہ اقبال کے افکار تھے۔ یہ مقالہ علی شریعتی کے ایک لیکچر "اقبال: مصلح قرن آخر" سے ماخوذ ہے۔

علی شریعتی سے پہلے ایران میں اقبال کی حیثیت

اقبال کی وفات کے وقت علی شریعتی کی عمر پانچ برس کی تھی، اس وقت ایران ابھی اقبال کے انقلابی افکار سے واقف نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۴۳ء میں ایران سے ایک ثقافتی وفد ڈاکٹر علی اصغر حکمت اور ابراہیم پور داؤد کی سربراہی میں ہندوستان آیا تھا۔ پور داؤد شانتی نکیتن یونیورسٹی میں چند سال رہے تھے اور ڈاکٹر ٹیگور کی شخصیت اور ان کے افکار سے بڑے متاثر تھے۔ لاہور میں ان سے اقبال کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا "اقبال ایک شاعر محلی بودہ است، در ایران کسی اور انمی شناسد۔" ٹیگور اور اقبال کا موازنہ کرتے ہوئے ٹیگور کو آفاقی شاعر اور اقبال کو مقامی شاعر قرار دیا۔

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں، جب کہ قوم پرستی کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا تھا، محمد حسین مشائخ فریدنی نے اسرار خودی اور رموز بے خودی کے ایرانی ایڈیشن میں لکھا کہ:

"از رجال و فضلای ایرانی تنہا آقای عباس آرام را می شناسم کہ

بامرحوم اقبال دوست و معاصر بوده است"

آقای سعید نفیسی اور اقبال کے درمیان خط و کتابت رہی، مگر محمد حسین مشایخ فریدنی کے مطابق چوتھی دہائی کے آغاز میں اہل ایران گاندھی، نہرو، جناح اور ابوالکلام آزاد کے ناموں سے تو واقف تھے مگر بعض خواص ابھی اقبال کے مرتبہ و مقام سے آگاہ ہونا شروع ہوئے تھے۔ اس عہد میں شاعر ایران بہار نے اقبال کی تعریف میں بہت سے اشعار کہے۔

بعد میں سعید نفیسی اور علی اصغر حکمت کے علاوہ مجتبیٰ مینوی، محیط طباطبائی نے اقبال پر لکھنا شروع کیا۔ یہ سلسلہ پاکستان بننے کے بعد تیز تر ہوتا چلا گیا اور سید حسن تقی زادہ، سید ضیاء الدین طباطبائی، علی اکبر حسین علاء، ڈاکٹر صورت گر، ڈاکٹر معین محمد حجازی، صادق سرمد، ناظرزادہ کرمانی، احمد علی رجائی، احمد سروش، ڈاکٹر رسا، ذبیح اللہ صفاء، ڈاکٹر حسین خطیبی، سید رضا سعیدی، ڈاکٹر یوسفی اور علی شریعتی اور دوسرے دانشوروں نے اقبال کی شخصیت اور ان کے افکار کی تشریح و تشہیر میں بھرپور حصہ لیا۔

چونکہ ایرانی سبک ہندی کو اہمیت نہیں دیتے تھے اس لیے وہ اقبال کی زبان کی بجائے ان کے افکار سے زیادہ متاثر تھے۔ اس متاثر ہونے والے حلقے میں علی شریعتی کا نام سرفہرست تھا۔ اسی عہد میں اقبال کے فارسی کلام کا ایک ایڈیشن "کلیات اشعار فارسی، مولانا اقبال لاہوری" کے نام سے تہران میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ محمد حسین مشائخ فریدنی نے اسرار خودی اور رموز بے خودی کا ایک خوبصورت ایڈیشن اپنے مقدمہ اور حواشی کے ساتھ شائع کیا۔

ایرانی انقلاب اور شریعتی

ان دانشوروں میں جنہوں نے شاہ ایران اور پہلوی حکومت کے خلاف تحریک چلائی ان میں ایک اہم نام علی شریعتی کا ہے۔ علی شریعتی بھی

اقبال کی طرح اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ اقبال نے لندن اور جرمنی میں جب کہ علی شریعتی نے فرانس میں تعلیم حاصل کی۔ شریعتی کے عہد میں فرانس، الجزائر اور دوسرے افریقی ممالک کی آزادی پسند انقلابی تحریکوں کا مرکز تھا۔ علی شریعتی قرآن اور حدیث کے بعد کلام اقبال سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ ان کی دو تحریریں جو حسینیہ ارشاد سے شائع ہوئیں یعنی "ما و اقبال" اور "اقبال مصلح قرن آخر" ہندوستان پہنچیں۔ اپنے موضوع پر لکھنے سے پہلے علی شریعتی کی زندگی پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

۱۹۷۹ء میں ایران میں جو اسلامی انقلاب آیا، وہ صرف امام خمینی ہی کی جدوجہد کا نتیجہ نہ تھا۔ کیوں کہ تاریخ کے تمام اہم انقلابات، جنہوں نے قوموں کی تاریخ کا رخ تبدیل کر دیا، کسی فرد واحد کی محنتوں کا ثمرہ نہیں تھے۔ اگر ایران "مرگ برشاہ" اور "درود بر خمینی" سے گونج رہا تھا اور ایرانی عورتیں ایک وقار اور حوصلے سے اپنے بچوں، بھائیوں، اور شوہروں کو اسلامی انقلاب کی راہ میں شہید دیکھ رہی تھیں اور ایران کے تمام مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں آیت اللہ خمینی کے افکار کی ترویج و اشاعت ہو رہی تھی تو اس سارے عمل میں ایران کے نوجوان طبقہ کی جدوجہد کا بہت بڑا حصہ تھا۔ شاہ کی خفیہ پولیس "ساواک" نے نوجوان طبقہ کو شراب اور جنسی بے راہ روی میں بری طرح مبتلا کر دیا تھا۔ لیکن علی شریعتی کی شعلہ بیانی اور بے لوث جدوجہد نے اس طبقے کو شراب و شباب کی راہ سے ہٹا کر انقلاب کا ہراول دستہ بنا دیا۔

علی شریعتی کے حالات زندگی

ڈاکٹر علی شریعتی (۲۳ نومبر ۱۹۳۳ء) میں خراسان کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے، علی شریعتی کے دادا آخوند حکیم نے تحریک شروطیت کے شروع ہونے سے اسی (۸۰) سال پہلے ایرانی معاشرہ میں فلسفہ اور فقہ کی

اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اتنا کمال پیدا کر لیا تھا کہ ان کی شہرت تہران، مشہد، اصفہان، بخارا اور نجف کے علمی و مذہبی حلقوں میں پھیل چکی تھی۔ بالخصوص تہران میں ان کی علمیت و مذہب پسندی کا اعتراف بطور خاص کیا جاتا تھا۔ اس شہرت کے باعث شاہ ناصر الدین قاچار نے انہیں تہران کے مدرسہ سپہ سالار میں فلسفہ پڑھانے پر مامور کر دیا۔ مگر وہ چند برسوں کے بعد بہمن آباد میں رہائش پذیر ہوگئے اور یہیں سے علم و اخلاق کی روشنی پھیلاتے رہے۔

سات برس کی عمر میں علی شریعتی کو مازنیان کے ایک مکتب میں داخل کیا گیا۔ بعد ازاں "دبستان ابن یمین" اور "دبیرستان فردوسی" مشہد میں تعلیم حاصل کی۔ مازنیان ایک انتہائی پس ماندہ قصبہ تھا، یہاں کے رہنے والے زندگی کی تمام آسائشوں سے تقریباً محروم تھے اور بڑی تنگی ترشی سے گزر اوقات کرے تھے۔ علی شریعتی کو یہیں سے غربت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اس پسماندگی کو ختم کرنے کے لیے ان میں انقلابی جذبات پرورش پانے لگے۔

۱۳۲۹ھ میں انہوں نے مشہد کے ٹیچرس کالج کے دو سالہ نصاب میں داخلہ لیا اور ۱۳۳۱ھ میں احمد آباد کے گاؤں میں جو مشہد کے اطراف میں تھا، معلم بن گئے۔ اپنا مطالعہ برقرار رکھا اور چار برس بعد حضرت ابوذر غفاریؓ پر اپنی کتاب شائع کی۔ اس کتاب میں حضرت ابوذرؓ کو "اولین خدا پرست سوشلسٹ" کے نام سے موسوم کیا۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوانی ہی سے ان کا دل و دماغ انقلابی جذبات کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ مگر حصول علم کی لذت انہیں ۱۳۳۴ھ میں مشہد یونیورسٹی لے گئی۔ اسی دوران انہیں اپنی ایک ہم جماعت لڑکی سے محبت ہوگئی جو بعد میں ان کی بیوی بنیں، اور وہ (مسز شریعتی) اپنے خاوند کی موت کے بعد بھی بقید حیات رہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب آیت اللہ کاشانی اور ڈاکٹر مصدق نے تیل کی صنعت کو قومیا لیا تھا۔ مگر امریکی ایجنٹوں کے باعث کامیاب نہ ہوسکے اور رضا

شاہ پہلوی نے اقتدار دوبارہ سنبھال لیا۔ اسی زمانے میں آیت اللہ طالعانی، ڈاکٹر ید اللہ سبحانی اور مہدی بازرگان نے قومی تحریک شروع کی۔ اس تحریک میں علی شریعتی بھی شریک ہوگئے۔ ۱۳۳۶ھ میں اس تحریک کو خلاف قانون قرار دیا گیا پورے ایران میں اس تحریک کے تمام مراکز بند کر دیئے گئے اور اس کے سرگرم کارکنوں کو چن چن کر گرفتار کر لیا گیا۔ علی شریعتی اور ان کے والد آقائے محمد تقی کو بھی گرفتار کر کے ایک فوجی ہوائی جہاز کے ذریعہ مشہد سے تہران لے جایا گیا اور "قزل قلعہ" کی جیل میں آٹھ ماہ کی سخت قید و بند اور ایذا رسانی کے بعد رہا ہوئے تو مشہد چلے آئے اور ۱۳۳۸ھ میں علی شریعتی نے فرسٹ ڈویژن میں اپنا کورس پاس کر لیا۔

علی شریعتی فرانس میں

مشہد یونیورسٹی نے ان کے ذہن کو جلا دی اور ان کی ساری فطری صلاحیتیں ابھر کر سامنے آگئیں۔ اچھے نمبروں میں امتحان پاس کرنے کی وجہ سے اساتذہ کی نظر میں وہ بہت عزیز تھے، خواہش تھی کہ وہ ایران سے باہر جا کر تعلیم حاصل کریں۔ چنانچہ ان کی کوششوں سے یونیورسٹی کے سینٹ نے ان کو وظیفہ دے کر ملک سے باہر تعلیم حاصل کرنے کا ریزولیشن پاس کیا۔ مگر رضا شاہ کی خفیہ پولیس ساواک کے سربراہ کی مداخلت سے وہ ایران سے باہر تعلیم حاصل کرنے نہ جاسکے۔ مگر متعدد حمایتیوں کی طرف سے ساواک پر اتنا دباؤ ڈالا گیا کہ بالآخر شریعتی کو پاسپورٹ اور ویزا مل گیا۔ اور انہوں نے فرانس کی یونیورسٹی میں جماعت شناسی (سوشیالوجی) کے شعبہ میں داخلہ لے لیا۔ فرانس کی آزاد فضا میں تحصیل علم کے ساتھ عملی کاموں میں ہی حصہ لیتے رہے۔ اور اسی زمانے میں بہت سے انقلابی مقالے لکھے۔ شریعتی علمی سرگرمیوں کے باوجود "سازمان انقلابی جوانان ملئی ایران" کی یورپی شاخ کے سرگرم رکن بن گئے۔

طلبہ کی اس شاخ نے شریعتی کی ادارت میں "ایران آزاد" کے نام سے ایک روزنامہ نکالنا شروع کیا۔ ہر چند یہ اخبار بہت دنوں زندہ نہ رہا مگر اپنی مدت اشاعت میں ایرانی طلبہ میں انقلاب کی زبردست آگ بھڑکا دی۔ اس زمانے میں علی شریعتی کا تعلق ایک آزادی پسند جماعت "المجاہد" سے قائم ہوگیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب الجزائر کے عوام فرانس کی استبدادی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کے لیے زبردست جدوجہد کر رہے تھے۔ علی شریعتی نے الجزائر کے عوام سے کھل کر ہمدردی کا اظہار کیا اور ان کے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر فرانسیسی سامراج کو بے نقاب کرنے لگے۔ اسی زمانے میں وہ ہواری بومدین اور بن بیلا سے آشنا ہوئے اور ان کے افکار سے متاثر بھی ہوئے۔

فرانس میں رہائش کے دوران علی شریعتی کو وہاں کے ادیبوں، دانش وروں اور ستم رسیدہ افراد کی حمایت کرنے والوں سے ملنے کا موقع ملا۔ وہ اپنے بعض استادوں سے بھی متاثر ہوئے۔ اور یہ استاد بھی ان کی علمی لیاقت، محنت اور آزادی کی تڑپ کے زبردست معترف تھے۔ ان میں سے گورویچ اور لوئی ماسینوں سے خاص طور پر متاثر تھے۔ یہ عمرانیات کے مشہور عالموں میں شمار کئے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ شوارنز، سارتر، ہنری لوموزوژان کوکتو جیسے دانش ور بھی ان سے شناسا تھے۔ اور تبادلہ خیال کرتے رہتے تھے۔ مگر شریعتی گورویچ سے خاص طور پر متاثر تھے۔ ان کے علمی اثر کے باعث وہ اپنے خیالات و افکار کو ترتیب دینے کے عادی بن گئے۔

الجزائر کی تحریک آزادی سے قلبی لگاؤ اور عملی طور پر ان کی مدد کرنے کے "جرم" میں فرانس کی حکومت نے انہیں گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا مگر ان کے استادوں اور دانشوروں کے دباؤ سے رہا کر دیا۔ علی شریعتی نے افریقی انقلابیوں کو ایران سے روشناس کرایا اور مشہور افریقی انقلابی عمر اوزغان (صاحب افضل الجہاد) کے افکار کو خاص طور پر پیش نظر رکھا پانچ برس کے بعد

سار بون یونیورسٹی سے سوشیالوجی میں ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے بعد وطن واپس ہوئے۔

۱۹۶۴ء میں انہوں نے ایران کی سرزمین پر قدم رکھا، چونکہ وہ فرانس میں برابر شاہ کی حکومت کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے، اس لیے انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ ان کی گرفتاری پر فرانس کے دانشوروں، ادیبوں اور استادوں نے پہلوی حکومت سے شدید احتجاج کیا اور اتنا دباؤ ڈالا کہ پہلوی حکومت نے مجبور ہو کر چھ ماہ کے بعد انہیں رہا کر دیا۔ اور مشہد کے مضافات میں واقع ایک مقام "فردوس" کے سکول میں معلم بنا دیا۔ کچھ دنوں کے بعد فردوس سے واپس بلا کر مشہد یونیورسٹی میں ان کا تقرر کر دیا گیا۔

مشہد یونیورسٹی میں نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد ان کے سامنے تھی۔ اس لیے انہوں نے ان کی تربیت کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ہر نوجوان علوم جدیدہ سے واقف ہونے کے باوجود اسلامیت اور مشرقیت سے بے بہرہ تھا۔ علی شریعتی نے انتہائی لگن اور انہماک کے ساتھ نئی نسل کی رہبری کا فریضہ انجام دینا شروع کر دیا۔ وہ جو کچھ بھی پڑھاتے اس کو اسلام کی کسوٹی پر پرکھتے جاتے اور طلبہ کو بتاتے کہ جو کچھ انہیں پڑھایا جا رہا ہے اس میں سے کون کون سے افکار کو ایک مسلمان کی حیثیت سے قبول کرنا چاہیے۔ اور کن کن کو رد کر دینا چاہیے۔ اس طرح اسلامی اقدار کی ترجمانی کی وجہ سے اپنے طلبہ میں مقبول ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ دوسرے مضامین کے طلبہ بھی اجازت لے کر ان کی کلاس میں آکر ان کا لیکچر سنتے۔ جب ان لیکچروں کا شہرہ بڑھا تو دوسری یونیورسٹیوں کے طلبہ بھی اپنے اپنے جلسوں میں ان کو بلانے لگے اور علی شریعتی ان جلسوں میں اپنے گہرے علم اور پرزور خطابت سے طلبہ کے اندر ایک نئی زندگی اور نئی روح پھونکنے لگے۔

۱۳۴۹ھ میں تہران کے مشہور دینی مدرسہ حسینیہ ارشاد میں ان کا آنا

جانا شروع ہوا۔ حسینیہ ارشاد کی بنیاد رکھنے والوں میں کئی علماء اور دانشور شامل تھے جن کا مقصد ایسے طلباء پیدا کرنے تھے، جو ایک طرف تو اسلام کے تمام اصولوں سے واقف ہوں اور ان پر عملی لحاظ سے کاربند بھی ہوں، اس کے ساتھ ساتھ علوم حاضرہ پر بھی ماہرانہ نگاہ رکھتے ہوں، اپنے اجتہاد کے ذریعے ایرانی قوم کی رہنمائی کر سکیں اور اس طرح استبداد کو بھی توڑنے کی طاقت رکھیں۔ لہٰذا حسینیہ ارشاد کے طلباء بھی بار بار علی شریعتی کو بلاتے اور ان کی شعلہ بار تقریروں میں طلبا کے علاوہ تہران کے وکلا، ڈاکٹر، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ بھی بڑی تعداد میں ہوتے۔ یہ تقریریں ٹیپ کر لی جاتیں اور یہ کیسٹ ہزاروں کی تعداد میں بکتے اور خریدنے کے لیے لوگوں کی بھیڑ لگ جیتی۔ ان لیکچروں کا موضوع عمرانیات کے علاوہ تاریخ عالم، تاریخ اسلام، مذہب کا صحیح تصور، فلسفہ، تاریخ اور غرب زدگی کے اثرات ہوتا تھا۔ اس ساری مقبولیت اور تگ و دو کا نتیجہ یہ ہوا کہ خفیہ پولیس ساواک نے حسینیہ ارشاد کے مدرسہ کو بند کر دیا، علی شریعتی کی کتابیں ضبط کر لی گئیں۔ اور ان کی تقریر پر پابندی لگا دی گئی۔

علی شریعتی کو حسینیہ ارشاد کے بند ہو جانے کا اور ایک پلیٹ فارم کے چھن جانے کا دکھ تھا انہوں نے اپنی اہلیہ کو لندن سے لکھا کہ "جس طرح پیغمبر ﷺ کے موذن حضرت بلالؓ شکنجے میں کسے ہونے کے باوجود جب بھی ہوش میں آتے تو صرف ایک ہی لفظ "احد" احد کہا کرتے۔ اسی طرح میری زندگی جب تک ہے، میری سانس برقرار ہے، میں بھی جب کبھی ہوش میں آؤں گا تو صرف ایک ہی لفظ "حسینیہ" "ارشاد" "ارشاد" کے علاوہ اپنی زبان سے کوئی اور لفظ ادا نہ کروں گا۔"

اسی سلسلہ میں ان کی اہلیہ نے بتایا کہ جب بھی علی شریعتی کو فرصت کے لمحات ملتے تو وہ ان سے صحابی رسولؐ حضرت ابوذرؓ کی باتیں کیا کرتے، ان کی

اہلیہ کا خیال ہے کہ جس جذبہ نے انہیں علی شریعتی بنایا وہ جذبہ بوذری تھا جو ان کے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ ان کی سیرت کی تشکیل میں حضرت ابوذرؓ کا واقعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے جب ان کو ربذہ کے مقام پر نظربند کر دیا گیا اور وہ معاشی طور پر بہت تکلیف میں رہے، مگر اپنے موقف سے ذرہ بھر انحراف نہیں کیا۔

تقریباً تین سال کا عرصہ انہوں نے اس "زندان سکوت" میں گزارا اس سے تنگ آکر انہوں نے ایران سے باہر جانے کا ارادہ کر لیا اور پولیس نے بھی عافیت اسی میں جانی کہ انہیں باہر جانے کی اجازت دے دی جائے۔ چنانچہ وہ لندن چلے گئے۔ تین ماہ کے بعد ان کی اہلیہ اور بچے بھی لندن چلے گئے۔ لیکن اہلیہ کو لندن کے ہوائی اڈے پر روک لیا گیا۔ وہ رات دیر تک اپنی بچیوں کے ساتھ باتیں کرتے رہے مگر ۱۹ جون ۱۹۷۷ء کی صبح کو جب سب کی آنکھ کھلی تو پتہ چلا کہ علی شریعتی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ہیں۔ پتہ چلا کہ لندن میں مقیم ساواک کے سپاہیوں نے انہیں زہر دے دی۔ ان کے بڑے لڑکے احسان شریعتی جو امریکہ میں زیر تعلیم تھے، ان کا جسد خاکی دمشق لے گئے، کیوں کہ تہران میں شاہ حکومت نے دفن ہونے کے لیے انہیں دو گز زمین دینے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ انہیں دمشق کے قبرستان زینب میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

علی شریعتی کی تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی زندگی پر مذہب کی مضبوط گرفت تھی۔ ان کی رائے یہ ہے کہ مذہب کی دو قسمیں ہیں ایک حقیقی مذہب ہے جس کا مقصد معاشرہ کی طبقاتی یا قابیلی تقسیم کو ختم کر کے غیر طبقاتی یا ہابیلی معاشرہ کی تشکیل کرنا تھا۔ ان کے نزدیک طبقاتی معاشرہ، جس میں پیداوار کے ذرائع پر چند افراد کا قبضہ ہوتا ہے۔ ایک مشرک زدہ معاشرہ ہوتا ہے جب کہ غیر طبقاتی معاشرہ جس میں ذرائع پیداوار پر عوام کی بالادستی ہوتی ہے، توحیدی معاشرہ ہوتا ہے۔ دوسرا مذہب مسخ شدہ مذہب ہوتا ہے۔ اس مذہب

میں معاشرہ سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، بلکہ چند رسوم و ظواہر کی ادائیگی، عبادات گاہوں کی تزئین و آرائش اور مذہبی پیشواؤں کی اطاعت ہی نجات کا باعث سمجھا جاتا ہے۔ یہ مذہب پیشواؤں اور بالادست طبقات کی ملی بھگت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہی قابیلی مذہب ہے جو تاریخ میں بار بار فرعون، قارون اور مذہبی پیشوائی شکل میں ابھرتا رہتا ہے۔ یہی لوگ انسانی معاشرہ میں سارے فساد جنسی ابتذال، قتل و غارت اور لوٹ مار کا باعث ہیں۔

صحیح مذہب کے اصولوں پر اگر اخلاص سے عمل کیا جائے تو اس جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے عہد میں انسان اور معاشرہ امن و آشتی اور سکون قلب سے زندگی بسر کرسکتا ہے۔ علی شریعتی کے نزدیک انسانی تاریخ حقیقی اور مسخ شدہ مذہب کے درمیان باہمی آویزش کی تاریخ ہے۔

یہ علی شریعتی کی صحیح مذہبی تربیت کا نتیجہ تھا کہ وہ اسوۂ بوذرؓ کے قائل تھے اور اسی وجہ سے وہ مذہب کے دل دادہ رہے۔ اگر وہ مذہبی نہ ہوتے تو سوشلسٹ ہوتے۔ انہوں نے سوشلزم، کیمونزم اور وجودیت تینوں فلسفوں کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان کے جو اجزاء حقیقی مذہب سے متصادم نہیں تھے انہیں بلا جھجک اپنا لیا۔ چنانچہ وہ نہ صرف نوجوانوں کے بلکہ علماء کے نزدیک بھی ایک پسندیدہ دانشور تھے۔

ڈاکٹر عزمی کے نزدیک شریعتی کی شخصیت جدید مغربی علوم اور اسلامی علوم کے عمیق مطالعے سے عبارت تھی۔ اپنے اس گہرے مشاہدے اور مطالعے سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی اقوام اور معاشروں میں تمام فساد، ذہنی الجھنیں، ناآسودگیاں، جنسی ابتذال اور غربت و جہالت، مغربی استعمار کی پیدا کردہ ہیں۔ استعمار نے ان اقوام کی جواں نسل کو ان کے اپنے صحت منت تمدن و مذہب سے دور کر دیا ہے اور انہیں مغرب زدہ بنا دیا ہے تاکہ وہ اپنی مصنوعات بیچ سکیں۔

مذہبی معتقدات کے بارے میں وہ مذہبی تقلید کو دین و ایمان کا دشمن قرار دیتے تھے۔ علی شریعتی نے قصہ آدم کی سائنٹیفک تعبیر و تشریح کی ہے اور ان کا فلسفہ تاریخ اور تصور مذہب اسی تعبیر پر مبنی ہے۔ مذہب، معاشرہ اور تاریخ کے متعلق ان کے افکار و نظریات کو ان کے ایک تاریخی خط میں جو انہوں نے اہرام مصر کے پاس بیٹھ کر پانچ ہزار برس قبل کے غلاموں کے نام لکھا تھا۔ اس خط میں (انبیاء کے صحیح مذہب) اور مسخ شدہ مذہب کی تاریخ کو بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔

اقبال علی شریعتی کی نظر میں

پہلی قسم

علی شریعتی نے عہد حاضر کے روشن فکر مفکرین کی دو قسمیں کی ہیں۔ پہلی قسم کو وہ فرنگی ماب روشن فکر کہتے ہیں جو مغرب کے فکری استعمار کو نہ پہچاننے کے باعث مغرب اور اس کی تہذیب کو اپنانے کی تلقین کرتی ہے۔ مغرب کا یہی فکری اور تمدنی استعمار ہے جو ہمارے افکار و خیالات اور ملی احساس کو ختم کر دیتا ہے۔ ہمارے اندر مذہب سے برگشتگی پیدا کرتا ہے۔ اس کے بعد معاشی اور فوجی حملے شروع کر دیتا ہے اگر تمدنی و تہذیبی استعمار کا وجود نہ ہوتا تو معاشی اور سیاسی سامراج کا راستہ بھی نہ کھلتا۔ مغرب زدہ روشن فکر کی جڑیں اپنی قومی تاریخ میں نہیں ہوتیں۔ یہ روشن فکری مذہب کی ہر شکل اور ہر حیثیت کی مخالف ہے وہ اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ اگر یورپ نے مذہب کو رد کیا تو وہ ایک مثبت اور ترقی پسند قدم تھا، کیونکہ رومن کیتھولک کا رویہ علم دشمن اور رجعت پسند اقدار کا حامل تھا۔

ان نام نہاد روشن فکر اور ترقی پسندوں کی مذہب دشمنی تیسری دنیا کے معاشروں میں استعمار کے لیے ایک منڈی کی فراہمی کا ذریعہ بن گئی۔ ان

معاشروں کی تاریخ، ان کی روح مقامی ترقی پسندی کے دعویداروں کے ہاتھوں تباہ ہوئی۔

دوسری قسم

روشن فکری کی دوسری قسم مغربی استعمار کی مخالف ہونے کے ساتھ اپنی قوم اور تہذیب و تمدن کی جڑوں کی طرف مراجعت ہے۔ یہ روشن فکری اس بات کو انتہائی شرم ناک قرار دیتی ہے کہ جدید تعلیم یافتہ لوگ جنہیں دنیا شناسی، انسان دوستی اور ترقی پسندی کا حامل سمجھا جاتا ہے، مذہب بیزار لوگ ہیں۔ حالانکہ تیسری دنیا کے معاشرے مذہبی معاشرے ہیں۔ اقبال کا تعلق اسی دوسری قسم کی روشن فکری سے ہے۔ جو مغربی سامراج اور اس کی تہذیب کا آلہ کار بننے کے لیے تیار نہیں۔

علی شریعتی کہتے ہیں کہ ایک حقیقت پسند کی حیثیت سے وہ یہ مانتے ہیں کہ اسلام ایک اجتماعی، سیاسی و معاشی غیر طبقاتی تہذیب و تمدن کا حامل ہے۔ کیونکہ ہمارے معاشرے میں اسلام ہی ہمارے معاشرے کی تاریخ ہے اور ملی تہذیب و تمدن بھی، اسلام ہی عوام الناس کی ذات کو بیدار، انصاف پسند، استبداد مخالف بنانے والا ہے اور اپنے پیروؤں کو انسانی، اجتماعی اور مادی عزت بخشنے والا بھی۔ اس حقیقت کو نہ سمجھنا، کچھ بھی نہ سمجھنے کے مترادف ہے۔ روشن فکری کا بجز اس کے کوئی اور فریضہ نہیں ہے کہ وہ کسی معاشرہ کی تہذیب و تمدن اور اس کی معنوی و ملی شخصیت کی اساس پر (اس معاشرہ کے لوگوں کو) ان کی ملی اور طبقاتی (اصلیت) سے آگاہ کرا دے۔ اقبال کی ساری فکری جدوجہد انہی معنوں میں روشن فکر اور ترقی پسند تھی۔

علی شریعتی جمال الدین افغانی کو اسلامی نشاۃ ثانیہ کے پہلے نقیب قرار دیتے ہیں اور اقبال کو ان کے بعد دوسرا نقیب تصور کرتے ہیں۔ وہ اقبال کو اس

"متلاطم وقت" اس "بنجر سرزمین" اور اس "پر آشوب ریگستان" میں دانائے راز تصور کرتے ہیں۔

مسخ شدہ اسلام

علی شریعتی کہتے ہیں کہ ہمارے عہد کا "اسلام" ہمارے اندر حرکت پیدا نہیں کرتا، بلکہ ہم کو سکوت، سکون اور قناعت کا درس دیتا ہے۔ اسلام کے نام سے آج جو معانی و مفاہیم ہمارے سامنے پیش کئے جاتے ہیں وہ ہمارے اپنے وضع کردہ ہیں۔ جن کا اسلام کے حرکی مزاج سے کوئی تعلق نہی۔

حقیقی اسلام

یہ روح (حقیقی اسلام) اپنی اولین شکل میں کب سامنے آئے گی۔ جس نے صرف پچیس برس کے اندر آدمی کو بربریت سے نکال کر ایک ایسا انسان بنا دیا تھا جو دنیا میں ایک نئی تاریخ کا آغاز کرنے والا، تاریخ کے جبر کو توڑ کر اس کا رخ موڑنے والا تھا۔

قرون وسطیٰ کے تیرہ و تاریک اور طویل دور میں جب مسلمانوں کا شیرازہ بکھر چکا تھا، مسلم روح کو واپس لانے کے لیے عہد حاضر میں جس کسی نے صور اسرافیل پھونکا اور اس مردہ معاشرے میں حرکت، قوت، زندگی اور معانی کو جنم دیا، وہ اقبال تھے، جو مسلمانوں کی شیرازہ بندی کے لیے اپنے پاس آتشیں نفس رکھتے تھے۔

اقبال کیا تھے؟

اقبال، نے نہ تو غزالی، ابن عربی یا مولانا روم کی طرح صرف متصوفانہ اور ماورائی حالات، یا انفرادی تکمیل، تزکیہ نفس کے لیے پیچ و تاب کھایا اور نہ ہی سرسید احمد خان اور اس فکر کے دوسرے ہندوستانی علماء کی طرح اقبال اس

بات کے قائل ہیں کہ اسلامی معاشرہ کی حالت خواہ کچھ بھی ہو، اگر انگریزی تسلط کے تحت مروجہ علوم اور بیسویں صدی کی فکر کے مطابق قرآن کی عالمانہ، محققانہ اور فلسفیانہ انداز میں ایک تفسیر لکھ دی جائے، تو اسلام کا احیا ہو جائے گا۔

اقبال نہ تو اہل مغرب کے اس خیال کے موید ہیں کہ علم ہی انسان کی نجات، ارتقا اور تمام مسائل کا مداوا ہے اور نہ ہی وہ ان فلسفیوں کے ہم خیال ہیں جو انسان کی معاشی ضرورتوں کو اس کی تمام ضرورتوں کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔ اور نہ ہی وہ اپنے ہم وطن بدھ اور ہندو مفکروں کی طرح اس بات کے قائل ہیں کہ انسانی روح کا جنم کے چکر سے نکل کر نروان حاصل کر لینا ہی شریعت کی معراج ہے اور نہ ہی وہ اس خیال کے قائل ہیں کہ ایک ایسے ماحول میں جہاں بھوک، غلامی، ذلت و پستی موجود ہو، وہاں وہ پاک صاف بلند اور پاکیزہ خیالات کو جنم دے سکتی ہیں۔

اقبال بنیادی طور پر اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اسلام اگرچہ دنیا اور انسان کی مادی حاجتوں کی طرف پوری توجہ دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ انسان کو ایک ایسا دل بھی بخشتا ہے جو ان کے بہ قول "سپیدۂ سحری کے ذوق و شوق اور غور و فکر میں زندگی کے خوبصورت لمحات کو دیکھتا ہے۔"

اقبال کی مثال ایک عظیم صوفی کی سی ہے جس کی روح نتھری نتھری اور مادیت سے کنارہ کش ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک انسان بھی ہیں جو اپنے زمانے کی علمی، تیکنیکی فکر کی پیش رفت کو احترام کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

اقبال کا وجدان و احساس ایسا روحانی احساس و وجدان نہیں ہے جو علم و عقل اور علمی پیش رفت کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھتا ہو، اسی لیے ان کا علم بھی فرانسیسی بیکن اور کلوڈ برناڈ کی طرح خشک علم بھی نہیں ہے جو صرف مظاہر

قدرت کے باہمی ربط اور مادی زندگی کی طبعی قوتوں کے استعمال تک محدود ہو۔

وہ اس دنیا پر نظر ڈالتے وقت تعقل اور علم کو توانہی معنوں میں استعمال کرتے ہیں جو آج معروف ہیں مگر ان کے نزدیک علم و تعقل کا مقصود وہ نہیں ہوتا جو ہمارے زمانے میں سمجھا جاتا ہے بلکہ ان کے نزدیک علم و تعقل کا مقصود یہ ہے کہ دونوں عشق، احساس اور الہام کے مددگار، ان کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے اور قدم سے قدم ملا کر چلنے والے ہیں (اسی بنا پر) اقبال انسانی روح کے سفر میں علم اور تعقل کو انسانی روح کا ممد و معاون سمجھتے ہیں۔

بنی نوع انسان کے نام اقبال کا پیغام یہ ہے کہ اس کا دل حضرت عیسیٰؑ کی طرح، فکر سقراط کی طرح اور قوت و طاقت قیصر کی طرح ہو۔

تاریخ اسلام میں اقبال کا شمار غزالی کی صف میں ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہم ان کو اسلامی معاشرہ کا ایک مصلح بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ انسانی، اسلامی اور اس معاشرے کے سلسلے میں سوچ بچار کرتے رہتے ہیں جس میں وہ خود زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس معاشرے کی نجات اور آزادی کے لیے وہ جہاد بھی کرتے ہیں۔ ان کا یہ جہاد علمی اور تفنن طبع کے طور پر یا سارتر کے الفاظ میں "بائیں بازو کے روشن فکر سیاسی مظاہر" پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس ضمن میں وہ ایک ذمہ دار اور (Committed) کی حیثیت سے اس مسئلہ پر نگاہ ڈالتے ہیں، کام کرتے ہیں اور راہ نجات کی تلاش بھی کرتے ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ اقبال، مولانا روم کے بھی عاشق ہیں۔ مولانا روم کے روحانی سفر میں اقبال ان کے ہم سفر ہوتے ہیں۔ وہ ایک ایسے عظیم انسان تھے جن کی شخصیت کسی ایک ہی رخ یا کسی ایک ہی پہلو کی اسیر نہیں ہے، بلکہ وہ "مکمل و سالم مسلمان" ہیں۔ اگرچہ وہ مولانا روم سے عقیدت رکھتے ہیں، مگر کسی وقت بھی ان کی شخصیت مولانا کی شخصیت میں ضم نہیں ہوتی۔

اقبال ایک فلسفی کی حیثیت سے یورپ گئے، انہوں نے مغرب کے

فلسفیانہ مکتب فکر کو سمجھا۔ تمام لوگوں کو اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ بیسویں صدی کے فلسفی ہیں لیکن اس کے باوجود اقبال مغربی فکر کے اسیر ہو کر نہیں رہے بلکہ ناقدانہ فکر کے ساتھ بیسویں صدی اور مغربی معاشرہ میں زندگی بسر کرتے رہے۔

اقبال نے موجودہ دور کے تمام فلسفیانہ اور روحانی منازل کو اپنے اسلامی عرفان اور ایمانی بصیرت کے ذریعے طے کیا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک مہاجر مسلمان ہیں جو ہندوستان کے پراسرار سمندر کی گہرائیوں سے نکل کر یورپی فکر کی بلند چوٹی تک جاپہنچے لیکن وہ اس چوٹی پر جمے نہیں رہے بلکہ اپنے تعجب خیز سفر کی داستان لے کر ہمارے درمیان واپس آگئے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اسلام نے ایک بار پھر بیسویں صدی میں اپنی خود آگاہ، دردمند مگر پریشان حال نسل کے لیے اقبال کی شخصیت کی شکل میں "نمونہ سازی" کی ہے۔

اقبال ان رجعت پسندوں اور ماضی پرستوں میں سے نہیں ہیں جو جدید یا مغربی تہذیب کی ہر نئی چیز سے سمجھے بوجھے بغیر دشمنی رکھتے ہیں اور نہ ہی وہ ان گروہوں میں سے ہیں جن میں نقد و انتخاب کی جرات نہیں اور جو مغرب کے مقلد محض ہیں۔ اگر ایک طرف وہ علم کی خدمت کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ اس بات کو بھی محسوس کرتے ہیں کہ انسان کی تمام معنوی تگ و دو کی ضرورتوں اور تکمیل بشریت کے تمام تقاضوں کے لیے علم نہ صرف ناکافی ہے بلکہ ضررساں بھی ہے۔ اقبال کے پاس اس دشواری کا حل بھی موجود ہے۔ بہرحال وہ ایک ایسے شخص ہیں جو مشاہدۂ عالم کے لیے اپنا ایک مخصوص نقطہ نظر رکھتے ہیں اور یہ نقطہ نظر دنیا اور انسان کے بارے میں ایک روحانی فلسفہ پیش کرتا ہے جس کی بنیادوں پر اپنے سماجی مکتب فکر کی اساس رکھتے ہیں، اس سماجی مکتب فکر کو وہ اپنے معیار کے مطابق اور ہمارے زمانے کے انسانی سماج کے مصالح کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت علیؑ کے خطوط پر متشکل کرتے ہیں۔

(حضرت) علیؓ کے خطوط؟ کیا معنی! یعنی ایک ایسا انسان جس کا دل مشرقی ہے اور دماغ مغربی۔ ایک ایسا انسان جس کی فکر صحیح اور عمیق ہے اور اس کا عشق پرشکوہ، اور ایک ایسا انسان جو روح کے درد و آلام سے بھی واقف ہے اور زندگی کی گرانباریوں سے بھی۔ ایسا انسان جس کو خالق اور مخلوق دونوں کا عرفان حاصل ہے۔ اس نے اصلاح، تہذیب، اخلاق، انقلاب، اور فکری تبدیلیوں کی بنیاد ڈالی ہے اسی طرح اس نے ایک فلسفی کی حیثیت سے اس بات کا ادراک حاصل کر لیا جس کو فرانسیس بیکن کہا کرتا تھا یعنی علم کی خشک آنکھ وہ آنکھ نہیں ہے جو اس دنیا میں تمام حقیقتوں سے آشنا ہو جائے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم سب کی یہ آرزو ہے کہ اس دنیا میں جس میں کہ فکر و فلسفہ کے دوسرے تمام دبستان آج کے انسان اور مسائل کا کوئی معقول حل تلاش کر رہے ہیں، ہمارا بھی ایک مکتب فکر ہو جو ہماری تمام فلسفیانہ ضرورتوں کو پورا کر سکے ہم میں ایک ایسا انسان ہو جو ہمارے تمدن اور تمام معنوی و مذہبی سرمائے کا محرم ہو لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ زمانے کے تقاضوں سے بھی واقف ہو اور قرون وسطی میں زندگی بسر نہ کرتا ہو۔

اس وسیع اور گوناگوں منظر میں وہ تمام چیزیں جن کی ہم آرزو کرتے ہیں، اقبال کی شخصیت میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ کیونکہ اقبال کا منفرد کارنامہ ان کی وہ عظیم کامیابی ہے جو انہوں نے بیسویں صدی عیسوی کے اسلامی معاشرے میں ایک مسلمان کی حیثیت سے حاصل کی ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ وہ کامل شخصیت ہیں، میں یہ بھی نہیں کہتا کہ وہ علامتی شخصیت ہیں، نہیں، بلکہ وہ ایک ایسی شخصیت ہیں جو ایک مکمل مسلمان اور کامل اسلامی شخصیت کے تتر بتر ہونے کے بعد بیسویں صدی میں دوبارہ نئے سرے سے متشکل ہوئی ہے۔ اسلامی شخصیت کی یہ تشکیل نو ہی اس کام کی ابتداء ہے اور لازمی ہے کہ ہم روشن فکر مسلمان خود اپنے آپ کی اور اپنے

معاشرے کی تشکیل نو کی عظیم ذمہ داری کو محسوس کریں۔ یہ سید جمال الدین (افغانی) تھے جنہوں نے پہلی بار صدیوں سے خواب گراں میں سرمست ملت کو اس بات سے آگاہ کیا کہ وہ کیا تھی اور کیا ہوگئی؟ سید جمال الدین (افغانی) کی تحریک نے ملت کی بنجر زمین میں جو بیج بویا اقبال اس کے اولین ثمر نورس تھے۔

مصلح کے معنی

جیسا کہ کہا جاچکا ہے کہ اقبال مصلح ہیں؟ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مصلح سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ "اصلاح" معاشرے کو تمام پریشانیوں، گرانیوں، مصیبتوں اور بدبختیوں سے واقعی نجات دلاتی ہے؟ یا یہ ضروری ہے کہ ایک ایسا زبردست انقلاب لایا جائے جو فکر کو بھی متاثر کرے اور اجتماعی روابط کو بھی؟

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اقبال مصلح ہیں یا یہ کہ وہ سید جمال الدین (افغانی) کے بعد ایک عظیم مصلح کی حیثیت سے دنیا سے متعارف ہوئے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ وہ تدریجی تکمیل اور معاشرہ کی تدریجی اصلاح کے علمبردار ہیں، نہیں، ایسا نہیں ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایک عمیق اور دوررس انقلاب کے علمبردار ہیں، یہ انقلاب انداز فکر، انداز نظر، نصب العین اور تمدن کو یکسر منقلب کردینے سے عبارت ہے۔

اقبال کا مکتب فکر

اقبال کے عہد میں اسلام پر تین طرف سے حملہ ہو رہا تھا، مغربی استعمار، معاشی اور فوجی حملہ کر رہا تھا۔ اس کی تہذیب مسلم نوجوانوں کو ان کی اپنی تہذیبی جڑوں سے الگ کر کے انہیں مذہبیت (روشن فکری) اور جنس (sex) کا رسیا بنا رہی تھی۔

دوسری طرف روشن فکر دانشور جو عام طور پر مغربی دانش گاہوں کے تعلیم یافتہ تھے، نہ صرف اسلام بلکہ مذہب کو رجعت پسندی کا سب سے بڑا ذریعہ

قرار دے رہے تھے۔ اور مسلم نوجوانوں کو مذہب سے بدظن کر کے انہیں شراب، جنس اور خود پرستی کا دلدادہ بنا رہے تھے۔

تیسری طرف مسلم علماء عام طور پر اپنی قدیم نظام تعلیم سے وابستہ فکر کو عہد جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیے بغیر دینی مدرسوں کے ذریعے نوجوانوں کے ذہنوں میں انڈیل رہے تھے۔ وہ اسلام و قرآن کے نام پر ملوکیت، جاگیرداری اور بعد میں صنعتی سرمایہ داری کا جواز فراہم کر رہے تھے اور یہ سب باتیں آج بھی ہو رہی ہیں۔

اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے مغربی استعمار (سامراج) پر سخت تنقید کی۔ انہوں نے ملوکیت، جاگیرداری اور صنعتی سرمایہ داری پر زبردست تنقید کی۔ ان کے مقابل اسلام کے مخصوص فلاحی، معاشی تصورات اور عوامی جمہوریت کے تصور کو اجاگر کیا۔

اقبال نے اسلام اور مذہب کے خلاف کیے جانے والے پروپیگنڈے کا بھی توڑ کیا۔ اقبال کے نزدیک مسلمان اور تیسری دنیا کے اقوام کی اصل جڑیں ان کے مذہب میں پیوست ہیں، مارکسی ترقی پسند تحریک اور مغربی سائنسی فکر دونوں اس بات پر متفق تھے کہ مادہ اور حواس سے ماوراء نہ کوئی حقیقت ہے اور نہ ہی کوئی علم کا ذریعہ ہے۔ جدلیاتی مادیت اور مغربی سیکولرازم دونوں لامذہبیت کو فروغ دے رہے تھے اور آج بھی دے رہے ہیں۔ اقبال نے مذہب دشمن رجحانات کی بڑی جرات مندی اور نہایت اعلیٰ علمی سطح پر مخالفت کی۔ اقبال کے لیکچر، خطوط اور شاعری میں حقیقی اسلام اور مذہب کی تعلیم دی گئی ہے۔ اقبال نے معاشی لحاظ سے اسلام کو فلاحی نظام قرار دیا ہے۔ محنت کش عوام کے مفاد کی حمایت کی ہے۔

اقبال نے اپنے خطبات اور جاوید نامہ میں اجتہاد کے بند دروازوں کو کھولنے پر زور دیا ہے تاکہ اسلامی فکر کی طرح اسلامی فقہ کی تشکیل جدید کی

جاسکے۔ تقلید جامد، ماضی پرستی اور یونانی عقلیت کو انہوں نے مسلم ملت کے زوال و جمود کا باعث قرار دیا۔ اقبال کے نزدیک علماء اگر عصر حاضر کے جدید تقاضوں کو سمجھ لیں اور جدید علوم پر دسترس حاصل کرلیں تو امت کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بہتر طور پر کام کرسکتے ہیں۔

علی شریعتی کی رائے ہے کہ ایک ایسا معاشرہ جس میں ابھی تک جاگیرداری طریقہ (فیوڈالزم) رائج ہے جس میں اب بھی عمومی ناخواندگی موجود ہے، جدید مسائل کے متعلق کوئی قانون سازی نہیں ہے نہ ہی اس کا معاشرتی ڈھانچہ جمہوریت اور ترقی پسندانہ ہے مگر اس کا وجود بیسویں صدی میں ہے۔ اس معاشرے کے سلسلہ میں بیوروکریسی، جمہوریت، مشین ازم، پرولتاریہ طبقہ، لبرل ازم، بورژوازی، انسان دوستی، بین الاقومیت، آفاقی معاشرہ وغیرہ کی باتیں کرنا جو خالص بیسویں صدی عیسوی کے معاشرہ کے مسائل ہیں، ایک احمقانہ بات ہے۔

غرب زدگی سے جنگ کرنے کا ایک راستہ یہ ہے کہ واقعی اور حقیقی مغرب کو اچھی طرح شناخت کر لیا جائے۔ یہ حضرات جو فرنگی مابی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور یورپی تہذیب و تمدن پر والہ و شیدا ہیں۔ ان کی مثال بالکل ان رجعت پسند، متعصب اور قدامت پرست افراد جیسی ہے جو مغرب اور اس کے تہذیب و تمدن سے مکمل اختلاف کرتے ہیں۔

اقبال مغرب میں رہ کر ایران اور ایران کے تہذیب و تمدن سے بھی آشنا ہوئے اور انہوں نے معنویت، لطافت، روح ظرافت، بصیرت کی گہرائی کو جو اسلامی ایرانی تہذیب و تمدن کا خاصہ ہے، اپنے اندر سمولیا۔

ہم اسلامی فلسفہ کو اس کی دو قدیم صورتوں یعنی عرفانی اور صوفیانہ شکلوں میں جانتے ہیں یا اس سے بو علی سینا، ابن رشد اور ملا صدرا کے افکار کے ذریعے واقف ہیں یا پھر اس کو اس کی روایات کے گنبد میں محصور دیکھتے

ہیں، ہم جیسے لوگوں کے لیے ایک مسلمان مفکر کی حیثیت سے اقبال کی جہاں بینی اور فلسفیانہ رسائی ہمارے لیے انتہائی قیمتی ورثہ ہے۔

اگر ہم لوگ مارٹن لوتھر اور کالون جیسے مغربی مصلحین کے کاموں کی قدر و قیمت کو پہچان لیں اور اس مذہبی اصلاحی تحریک کا گہری نظر سے مطالعہ کریں جس نے عیسائی مذہب کے جمود و تعطل اور انحطاط کو پروٹسٹنٹ ازم کے نام سے نجات دلائی، اور ہم اس بات سے واقف ہوں کہ اس تحریک نے موجودہ دور کے یورپی تہذیب و تمدن کے ارتقا میں کیا رول انجام دیا ہے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ہمارے زوال پذیر اسلامی سماج کو سب سے پہلے اسی نوع کے مصلحوں یعنی مسلمان (Protestants) کی ضرورت ہے۔

یہ مصلحین ایک طرف تو اسلام سے بکمال و خوبی آگاہ ہوں اور دوسری طرف وہ اپنے معاشرے، موجودہ عہد کے مسائل اور ضرورتوں سے بھی واقف ہوں۔

یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال جیسے اسلام شناس مصلحوں کے کاموں کی قدر و قیمت اور ان کے چھوڑے ہوئے نقوش کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ جو اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ اجتماعی علوم کے بھی عالم ہیں اور جن کے سینوں میں ایک ترقی پسند، ذمہ دار اور استعمار مخالف دل دھڑکتا ہے۔ اسلامی معاشروں کے روشن فکر حضرات کو اس بات سے واقف ہونا چاہیے کہ وہ اپنے معاشرتی کاموں کی انجام دہی میں اقبال جیسے مصلحوں کے افکار کے کس حد تک محتاج ہیں۔

پس ماندگی، عام غربت، معاشرتی نابرابری اور بیرونی استعمار جیسے مسائل کسی معاشرہ کے طبیعی، مخصوص اور رائج مسائل نہیں ہیں کہ ان سے صرف چند ماہرین فن ہی نپٹیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم ایشیائی، لاطینی امریکی یا افریقی شخص کو روشن فکر ترقی پسند، مفکر اخلاقی انسان کہتے ہیں تو ان سب

اصطلاحوں سے ہمارا مطلب ہوتا ہے "استعمار مخالف" شخص خواہ وہ شخص مذہبی ہو یا غیرمذہبی، فلسفی ہو یا کسی فن کا ماہر ان تمام لوگوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

جب کسی مسلمان مصلح کی بات کی جاتی ہے تو اس میں یہ خصوصیت، استعمار کی مخالفت، کامل تر اور واضح دکھائی دیتی ہے۔

چونکہ اقبال ایک خود آگاہ مسلمان اور اسلامی مصلح ہونے کے ساتھ ساتھ استعمار مخالف بھی ہیں اس لیے ہندوستان کی آزادی اور ایک جدید معاشرہ کی بنیاد ڈالنے کے لیے ان کی وہ تمام کوششیں جو انہوں نے انگریزوں کی قید سے آزاد ہونے، رجعت پسندی سے چھٹکارا پانے، انحطاط و زوال سے رہائی حاصل کرنے کے لیے کیں، سب ہی لوگوں کے لیے قابل قبول نہیں۔ ان کی یہ کوششیں اس حد تک مقبول عام ہوئیں کہ بہت سے لوگ ان کو صرف ایک سیاسی مفکر، استعمار مخالف، تحریک آزادی کا نقیب سمجھنے لگے۔

اقبال کی مثال ایک ایسے فنکار کی سی ہے جو خود آگاہ بھی ہے اور احساس ذمہ داری کا حامل بھی، فن کی ذمہ داری اور اس کی (Commitment) اور فن کار کی اپنے زمانے اور اپنی سرزمین سے آگاہی و وابستگی ہے۔

اقبال ایک ایسے فنکار اور ذمہ دار شاعر ہیں جن کی (Commitment) اپنے زمانے اور اپنے معاشرے سے ہے۔ لیکن ان کی یہ کمٹمنٹ اس معنی میں نہیں ہیں اس کہ وہ اپنی فکر، احساس اور اپنے فنکارانہ اور ادبی تخلیق کے دامن کو چند سیاسی، اخباری اور مبتذل نعروں سے داغ دار بنا دیں۔ ان کے فن کا دائرہ چند روز مرہ کے سیاسی مسائل تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کا فن فکری اور انسانی قدروں کا حامل ہے جس کا ایک لازمی جزو استعمار مخالف ہونا بھی ہے۔

حرام مکتب فکر

اقبال افراط اور تفریط کی راہوں پر چلنے سے اجتناب کرتے رہے ہیں۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ یورپی تہذیب و تمدن، فلسفہ و اخلاق، فکر اور ہنر (Art) اور جدید طرز زندگی یہ ساری کی ساری چیزیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں اور ان سب چیزوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے ہمیں ان چیزوں کو مکمل طور پر قبول کر لینا چاہیے اور ہمارے یہاں جو چیزیں مذکورہ چیزوں سے متغائر ہیں ان کو مکمل طور پر اپنے آپ سے دور کر دینا چاہیے۔

بہت سے لوگ ایک دوسری انتہا پر چلے گئے ہیں یہ لوگ مغرب سے کسی بھی چیز کو مستعار لینے کے دشمن ہیں۔ یہاں تک کہ یہ حضرات موٹر کاروں پر سوار ہونے اور اس ڈاکٹر سے مشورہ علاج کرنے کو بھی ناجائز سمجھتے ہین جس نے طب جدید میں تعلیم حاصل کی ہے۔ مغربی فکر اور مغرب کے تمدنی و تہذیبی مظاہر کو بالکل رد کر دینے کا یہ جذبہ چین اور ہندوستان اور بالخصوص یہودی مذہبی رہنماؤں میں موجود اور آج بھی موجود ہے۔

اقبال نے سب سے پہلے مشرق و مغرب کے فکر (Thought) کا تجزیہ کیا اور دونوں کے طرز زندگی، تہذیب و تمدن کا موازنہ کرتے ہوئے اس نتیجے تک پہنچے کہ "مشرق نے حق کو تو دیکھا مگر دنیا کو نہیں دیکھا، مغرب نے دنیا کو دیکھا مگر حق سے گریزاں رہا۔" (مشرق حق را دید عالم را نہ دید۔ غرب عالم را دید حق را نہ دید)۔ اس کے بعد اعلان کرتے ہیں کہ مغربی تہذیب و تمدن کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ذلت کا فعل ہے اور مغرب کی غلامی کا بھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان تمام چیزوں سے دست بردار ہو جانا بھی ہے جو مشرق کے پاس موجود ہیں اور عالم انسانیت ان چیزوں کا احتیاج مند ہے یعنی حق پرستی، ذوق و شوق، ماورائی دانش، عالم غیب کی تلاش، فضیلت حاصل کرنے کی تمنا، روح مشرق کا وہ دائمی اضطراب جو تخلیق کا راز جاننے، حقیقت کلی کو سمجھنے اور

معمائے ہستی کو جاننے کے لیے بے تاب ہے۔ مغرب اور اس کے طرز تمدن سے گریز کرنا، عالم جمود میں آنے، کمزور ناتواں ہونے حتی کہ مغرب کی مطلق العنانیت کے بالمقابل اسیر ہو کر رہ جانے کے مترادف ہے۔

ان لاادری مفکرین کے خلاف جن کا خیال ہے کہ مغربی علم و صنعت کو اختیار کرنے کے بعد مغرب کے تہذیب و تمدن، اخلاق، معاشرتی روابط اور اس کے طرز زندگی سے کنارہ کش نہیں ہوا جا سکتا، اقبال کا کہنا یہ ہے کہ نہ صرف ایسا کیا جا سکتا ہے بلکہ ہم کو ایسا ہی کرنا چاہیے، اس طرح کی کسی دلیل کا وجود نہیں ہے جو اس بات کو ثابت کرے کہ ایک معاشرہ جو ارفع و اعلیٰ عشق، روح کے عرفان، دل کے اشراق، پاک لذتوں سے لطف لینے کے جذبے اور عمیق اخلاقیات و رومانیات سے آشنا ہو، لوہے کے ہل کی جگہ پر ٹریکٹر نہیں چلا سکتا اور اونٹ پر سواری کرنے کی بجائے جٹ طیارہ پر پرواز نہیں کر سکتا اور تیل کا چراغ جلانے کی جگہ بجلی کا بلب روشن نہیں کر سکتا۔

اقبال کا پیغام یہ ہے کہ ہم اپنی آگ کو اپنے سینوں میں روشن کئے رہیں اور ایمان، عرفان اور اس عظیم عشق کی روح کو دوبارہ اپنی جانوں میں مشعل کر دیں جو "انسان پرور" ہے تاکہ ہم لوگ ہستی کی روح، جان کے معنی اور وجود کے اصل مقصد پیدائش سے آشنا سے آشنا تر ہو جائیں اور جب ہم کو یورپ کی طرح سے طاقت و قوت حاصل ہو۔ مادی اور صنعتی منفعت حاصل کرنے میں کامیابی ہو تو ہم لوگ یورپ کی طرح گمراہی، خیال کی پراگندگی اور فکر کی تیرگی سے دوچار نہ ہوں۔ اپنی زندگیوں میں مذہب کو اس طرح مضبوط کر لیں کہ اسی کی قدرت و طاقت کے ذریعے ہم اپنے آپ پر قابو حاصل کر سکیں اور غیر انسانی میلانات، پست قسم کی بیماریوں مثلاً لالچ، خوف و خطر اور اپنی عادتوں کی غلامی سے نجات حاصل کر کے آزاد ہو سکیں۔ مزید براں ہم مغرب کا علم، ترقی یافتہ ٹیکنالوجی اور اس زندگی کی منطق کو اختیار کریں تاکہ دنیا ہمارے

زیر نگیں آ جائے اور ہم نیچر کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنا لیں۔ مذکورہ بالا دونوں باتوں کی مدد لے کر ہم اپنی ناتوانی و کم مائیگی اور نیچر کے جامد و قاہر عوامل پر فتح حاصل کر لیں اور اپنی مادی خواہشوں کی خود مختاری کے ذریعے جو جدید علم و تکنیک کے ذریعے ممکن ہے، ہم اپنی معنوی تکمیل، تلاش حقیقت، نوع انسانی کی پیشرفت کے راستے میں سبکنارانہ سرگرم سفر رہیں۔

پاکستان کی ضرورت اقبال کی نظر میں = اپنی جڑوں کی طرف مراجعت

اقبال کی خواہش تھی کہ پاکستان بیسویں صدی میں اسلام کا ایک عظیم اور نیا تجربہ بنے۔

یہ صرف مسلمانوں یا مشرق ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ عالم بشریت کی ضرورت ہے۔ وہ عالم بشریت جس کا نصف حصہ مشرق میں پلا، بڑھا اور ارتقا پذیر ہوا ہے اور نصف حصہ مغرب میں، یہ دونوں حصے کامل بشریت کا ایک ناقص نمونہ ہیں۔ عالم بشریت اس پرندے کی مانند ہے جس کا ایک بازو مشرق میں اور دوسرا مغرب میں ٹوٹ کر گر پڑا ہے۔ ہر چند کہ یہ دونوں بازو ایک دوسرے سے جدا ہو کر ارتقا پذیر بھی ہیں اور طاقت و قوت بھی پا رہے ہیں، لیکن ان کے اس ارتقا اور طاقت و قوت کے باوجود یہ پرندہ زمین سے اٹھ نہ سکے گا۔

اس پر شکستہ اور زمین پر پڑے ہوئے پرندے کے دونوں بازوؤں کو ان جگہوں پر جوڑنے کا نام اسلام ہے۔ یہ کوشش اس لیے ہے کہ یہ دونوں بازو ایک دوسرے کے ہم آہنگ اور ہم انداز ہو کر ارتقا کی راہ پر گامزن ہوں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اسلام کی قسمت خود ہی اس پرندے کی قسمت سے دو چار ہو گئی ہے۔ اقبال کوشش یہ ہے کہ وہ اس کی تشکیل جدید کریں۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال اور ان جیسے تمام خود شناس مسلمان مفکروں کی

مصلحانہ کوششیں کسی ایک مذہب یا کسی ایک ملت کے گنبد بے در میں محصور ہو کر نہیں رہ جاتیں بلکہ ان کی یہ کوشش عالم بشریت کی تشکیل جدید، ایک نئے تمدن کی بنیاد ڈالتے اور ایک نئی نسل انسانی کو عالم وجود میں لانے سے عبارت ہے، یہی وہ چیزیں ہیں جن کی قانون فطرت آرزو رکھتی ہے۔

سید جمال الدین افغانی کے بعد اقبال ایک ایسے مفکر ہیں جنہوں نے "اپنی اصل کی طرف مراجعت" کی تحریک کو اس امت میں جاری و ساری رکھا، جو خلیج فارس سے لے کر شمالی افریقہ اور چین تک پھیلی ہوئی ہے۔ اپنی اصل کی طرف مراجعت کی یہ تحریک، اس تحریک کی طرح نہیں ہے جو ان آخری ایام میں ہمارے یہاں در آئی تھی اور "غرب زدگی" کے بعد ہم خوش خوش "مشرق زدگی" اور "خود زدگی" کے جاہلی دور کی طرف دوبارہ واپس آ گئے ہیں۔ مقامی اور بدوی رسم و روایات کو زندہ کرنا اور ان کا مظاہرہ کرنا اور ان قومی خرافات اور روایات کی طرف واپس لوٹنا جو انحرافی روایات ہونے کے ساتھ ساتھ "پتھر کے عہد کے انسان" کی یاد دلاتی ہیں اور پس ماندگی کی بھی علامت ہیں۔ اپنی اصل کی طرف واپس جانا نہیں ہے۔

اپنی اصل کی طرف مراجعت کا معنی

اپنی اصل کی طرف مراجعت کا معنی ہے، ان فکری اور تمدنی اقدار کا احیا کرنا جو ہم کو آگاہی بخشے اور ترقی کی راہ پر گامزن کرنے والی ہوں۔

اپنی اصل کی طرف مراجعت کی یہ تحریک ایک عمیق، دشوار اور خودشناسی و خود سازی کی حامل تحریک ہے جس کا لازمہ یورپی تہذیب و تمدن اور آج کی دنیا کی تمام خوبیوں اور خامیوں کو جاننا پہچاننا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیب و تمدن، ادب و مذہب اور انسانی شرف و منزلت سے بھی آگاہ ہونا اور یہ جاننا ہے کہ وہ کون سے عوامل ہیں جو ہمارے معاشرے اور تمدن کو

انحطاط پذیر کرتے ہیں اور کون سے عوامل اس کو ارتقا کی راہ پر گامزن کرتے ہیں۔ عوام سے باہمی سمجھوتہ اور معاشرے سے تجانس (Homogenety) بھی اس تحریک کا ایک لازمہ ہے۔ ہمیں علم ہے کہ اقبال یورپ گئے، انہوں نے یورپ کی تہذیب و تمدن اور اس کے معاشرے کو گہری نظروں سے دیکھا اور اس کے بعد وہ اسلام کی طرف راجع ہوئے اور محنت و مشقت، غور و فکر، تعلیم، مطالعہ اسلام، قرآن فہمی، عرفان، عوام اور اسلامی حکومتوں کے صحیح مزاج سے آگاہی، ہندوستان کے معاشرے اور عالمگیر استعمار کے ذریعے انہوں نے اپنے آپ کو پہنچانا۔ اس طرح آخر کار "خود شناسی" اور "خود سازی" کے ساتھ وہ اپنی اصل کی طرف واپس آئے۔ تمام دنیا جہان اور ماضی و حال کی سیر کرنے کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو ایک ترقی پسند مسلمان، مفکر، آزادی خواہ، مشرقی، فلسفی، فن کار اور اسلامی ادیب پایا۔ اپنی اصل کی طرف مراجعت یہی ہے۔ بیسویں صدی میں جینا یہی ہے۔ ایک پسماندہ اور استعمارزدہ مشرقی اسلامی معاشرہ میں روشن فکر ہونا یہی ہے۔

ایران اور اقبال

شریعتی فرماتے ہیں کہ میں قوم پرستی کے مرض میں مبتلا نہیں ہوں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ایرانی فکر نے تاریخ اسلام کے بد ترین سیاسی دور میں بھی اس بات کا مظاہرہ کیا کہ اس نے حقیقت اسلام کو اس رخ سے نہیں جس رخ سے اس کے سامنے پیش کی گئی تھی، بلکہ اس رخ سے پایا ہے جس کو اس سے چھپایا گیا تھا کہ وہ تاریخ کو فراموش کر دے۔ ایرانیوں نے آغاز اسلام ہی سے بنی امیہ اور بنی عباس کی کوششوں کے علی الرغم اس حق کو جو کہ فراموش کیا جاچکا تھا اور اس راہ کو جو اسلام کی اولین راہ تھی، شناخت کیا اور ایرانی عبقریت ہی وہ تنہا طاقت تھی جس نے اسلامی تعلیمات، اس کی روح اور اسلامی تمدن کی

معنویت کو پھیلایا۔ دراصل بات یہ ہے کہ آج اسلام کی نشاۃ ثانیہ، روح اسلام کا احیاء اور خواب خرگوش میں سرمست مسلم معاشروں کی حرکت و بیداری کا سب سے پہلا مبلغ و سید جمال الدین اسد آبادی (افغانی) ہم ہی میں سے ایک تھا اور ان کی تحریک کو برقرار رکھنے والا اقبال بھی ہم ایرانیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

چوں چراغ لالہ سوزم درخیابان شما
ای جوانان عجم جان من و جان شما
حلقہ برگردم زنید اے پیکران آب و گل
آتشی در سینہ دارم از نیاگان شما